خطبہ تقسیم اسناد

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(کچھ مدت ہوئی مجھے ایک اسلامیہ کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد میں خطبہ عرض کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس موقع پر میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اسے فائدۂ عام کی خاطر ان صفحات میں نقل کیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی داد نہ دینا میں ظلم سمجھتا ہوں کہ جس تلخ صاف گوئی سے میں نے اپنے خطبہ میں کام لیا اسے وہاں نہایت ٹھنڈے دل سے سُنا گیا اور بہتوں نے صداقت کا اعتراف بھی کیا۔ کالج کے پرنسپل ایک ایسے صاحب تھے جو موجودہ زمانے کے "ترقی پسندوں" کی صفِ اول میں ہیں۔ میرے نقطۂ نظر سے ان کو سخت اختلاف ہونا ہی چاہیے لیکن اپنی "ترقی پسندی" کے ایک کھُلے دشمن کو دعوت دینے والے وہ خود ہی تھے اور اس کی تلخ گفتاری کو بھی سب سے زیادہ خندہ پیشانی کے ساتھ اُنہوں نے ہی سُنا۔ اگرچہ ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ تلخ صداقتیں مجھے ان دار العلوموں میں بھی جا کر عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جہاں مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کے ساتھ اس سے بدتر معاملہ ہو رہا ہے' لیکن میں جانتا ہوں کہ سوٹوں میں لاکھوں عیوب کے باوجود جتنے بڑے دل چھپے ہوئے ہیں جُبّوں میں اتنے بڑے دل بھی نہیں ہیں، جو کچھ میں ایک کالج میں کہہ گزرا اس کا بیسواں حصّہ بھی کسی دار العلوم میں اس سے بہت زیادہ ادب کے ساتھ دست بستہ عرض کروں تو جان کی اماں نہیں پا سکتا)۔

فاضل اساتذہ، معزز حاضرین اور عزیز طلبہ!

آپ کے اس جلسۂ تقسیم اسناد (قدیم اصطلاح کے مطابق دستار بندی)، میں مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا جو موقع دیا گیا ہے۔ اس کے لیے حقیقتاً میں بہت

---

[1] یہ خطبہ ۱۹۴۰ء میں اسلامیہ کالج امرتسر، پنجاب میں تقسیم اسناد کی تقریب میں عرض کیا گیا تھا۔

شکر گزار ہوں۔ حقیقتاً کا لفظ میں خصوصیت کے ساتھ اس لیے بول رہا ہوں کہ یہ شکر گزاری رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے اور گہرے جذبۂ قدرشناسی پر مبنی ہے جس نظام تعلیم کے تحت آپ کا یہ عالیشان ادارہ قائم ہے اور جس کے تحت تعلیم پاکر آپ کے کامیاب طلبہ سند فراغ حاصل کر رہے ہیں میں اس کا سخت دشمن ہوں اور میری دشمنی کسی ایسے شخص سے چھپی ہوئی نہیں جو مجھے جانتا ہے۔ اس امر واقعی کے معلوم و معروف ہونے کے باوجود جب یہاں اس تقریب پر مجھے خطبہ عرض کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تو فطری بات تھی کہ میرا دل ایسے لوگوں کے لیے قدر و اعتراف کے جذبہ سے بھر جائے جو اپنے طریق کار کے دشمن کی باتیں سننے کے لیے بھی اپنے قلب میں کافی وسعت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ مجھے آپ کی اس مہربانی پر بھی شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ آپ نے مجھے عین اس وقت اپنی قوم کے ان نوجوانوں سے خطاب کرنے کا موقع دیا ہے، جب کہ یہ آپ سے رخصت ہو کر ہماری طرف عملی زندگی کے میدان میں آنے والے ہیں۔ معزز سامعین! اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں تھوڑی دیر کے لیے آپ کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنے ان عزیزوں سے مخاطب ہو جاؤں جو آج یہاں سے ڈگری لے رہے ہیں کیونکہ وقت کم ہے اور

غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

عزیزانِ من! آپ نے یہاں اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی سال صرف کر کے تعلیم حاصل کی ہے۔ بڑی اُمنگوں کے ساتھ آپ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جبکہ آپ کو اپنی محنتوں کا پھل ایک ڈگری کی صورت میں یہاں سے ملنے والا ہے۔ ایسے موقع پر جسے آپ اپنے نزدیک مبارک موقع سمجھتے ہوں گے۔ آپ کے جذبات کی نزاکت کا مجھے پورا احساس ہے اور اسی لیے آپ کے سامنے اپنے

خیالات کا صاف صاف اظہار کرتے ہوئے میرا دل دُکھتا ہے۔ مگر میں آپ
سے خیانت کروں گا اگر محض نمائشی طور پر آپ کے جذبات کی رعایت کر کے وہ
بات آپ سے نہ کہوں جو میرے نزدیک سچی ہے اور جس سے آپ کو آگاہ کرنا
اس وقت اور اسی وقت ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ اس وقت آپ اپنی زندگی کے
ایک مرحلہ سے گزر کر دوسرے مرحلے کی طرف جا رہے ہیں۔ دراصل میں آپ کی
اس مادرِ تعلیمی کو ـــــ اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادرانِ تعلیمی کو ـــ
درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک آپ فی الواقع قتل کیے جاتے
رہے ہیں، اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں۔ یہ دراصل موت کے صداقت
نامے Death Certificates ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس
وقت دیے جا رہے ہیں جب کہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا
ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے۔ اب یہ
آپ کی خوش قسمتی ہے کہ اس منضبط اور منظم قتل گاہ سے بھی جان سلامت
لے کر نکل آئیں۔ میں یہاں اس صداقت نامۂ موت کے حصول پر آپ کو مبارکباد
دینے نہیں آیا ہوں بلکہ آپ کا ہم قوم ہونے کی وجہ سے جو ہمدردی قدرتی طور
پر میں آپ کے ساتھ رکھتا ہوں وہ مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میری مثال
اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتلِ عام ہو چکنے کے بعد لاشوں
کے ڈھیر میں ڈھونڈھتا پھرتا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان بسمل ابھی سانس
لے رہا ہے۔

یقین جانیے یہ بات میں مبالغہ کی راہ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں
اخباری زبان میں "سنسنی"، پیدا کرنا نہیں چاہتا فی الواقع اس نظامِ تعلیم کے

متعلق میرا نقطۂ نظر یہی ہے۔ اور اگر میں آپ کو ذرا تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ میں کیوں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں تو کیا عجب کہ آپ خود بھی مجھ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

شاید آپ میں سے ہر شخص اس بات کو جانتا ہوگا کہ اگر کوئی پودا ایک جگہ سے اُکھاڑ کر کسی دوسری ایسی جگہ لگا دیا جائے جہاں کی زمین، آب و ہوا، موسم ہر چیز اس کی طبیعت کے خلاف ہو، تو وہاں کبھی جڑ نہ پکڑ سکے گا۔ یہ دُوسری بات ہے کہ مصنوعی طور پر اس کے لیے وہی حالات پیدا کر دیے جائیں جو اس کی قدرتی جائے پیدائش میں تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لیبوریٹری کی مصنوعی زندگی ہر پودے کو تمام عمر کے لیے میسّر نہیں آسکتی اس غیر معمولی صورت حال کو نظر انداز کر دینے کے بعد یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ کسی پودے کو اس کی اصلی جائے پیدائش سے اُکھاڑنا اور ایک مختلف قسم کے ماحول میں لے جا کر لگا دینا دراصل اسے ہلاک کرنا ہے۔

اچھا، اب ذرا اس بدقسمت پودے کی حالت کا اندازہ کیجئے جو اپنی زمین میں سے اُکھاڑا نہیں گیا، اپنے ماحول سے نکالا بھی نہیں گیا، وہی زمین ہے، وہی آب و ہوا، وہی موسم ہے جس میں وہ پیدا ہوا تھا، مگر سائنٹیفک طریقوں سے خود اس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی گئی کہ وہیں اپنی ہی جائے پیدائش میں اس کی طبیعت اس زمین، اس آب و ہوا، اور اس موسم سے بے لگاؤ اور بیگانہ ہو کر رہ گئی اور وہ اس قابل نہ رہا کہ اس زمین میں اپنی جڑیں پھیلا سکے۔ اس ہوا اور اس پانی سے غذا حاصل کر سکے۔ اور اس موسم میں پھل پھول سکے۔ اس اندرونی تغیّر کی وجہ سے وہ بعینہٖ ایسا ہو گیا

جیسے کسی دوسری زمین کا پودا ہے اور اجنبی ماحول میں لاکر لگا دیا گیا ہے۔ اب وہ اس کا محتاج ہوگیا ہے کہ اس کے گرد مصنوعی فضا تیار کی جائے اور مصنوعی طور پر اس کی زندگی کا سامان کیا جائے۔ لیبوریٹری کی زندگی اگر اسے بہم نہ پہنچے تو جہاں پیدا ہوا ہے وہیں کھڑے کھڑے زمین چھوڑ دے گا اور مُرجھا کر رہ جائے گا۔

پہلا فعل یعنی ایک پودے کو اکھاڑ کر اجنبی ماحول میں جا لگانا چھوٹے درجہ کا ظلم ہے۔ اور دوسرا فعل یعنی ایک پودے کو اسی جگہ جہاں وہ پیدا ہوا ہے اپنے ماحول سے اجنبی بنا دینا اس سے عظیم تر ظلم ہے اور جب ایک دو نہیں لاکھوں پودوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جا رہا ہو، اور اتنے کثیر التعداد پودوں کے لیے لیبوریٹری کی مصنوعی فضا بہم پہنچانا محال ہو تو بیجا نہ ہوگا اگر اسے ظلم کے بجائے قتلِ عام کہا جائے۔

حقیقی صورتِ حال کا جو مطالعہ میں نے کیا ہے وہ مجھے بتاتا ہے کہ ان درس گاہوں میں آپ کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ آپ ہندوستان کی سرزمین میں مسلم سوسائٹی کے اندر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ زمین، یہی تمدنی آب و ہوا اور یہی تہذیبی ماحول ہے جس کی پیداوار آپ ہیں۔ آپ کے نشو و نما پانے اور پھل پھول لانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اسی زمین میں جڑیں پھیلائیں، اور اسی آب و ہوا سے زندگی کی طاقت حاصل کریں۔ اس ماحول سے آپ کو جتنی زیادہ مناسبت ہوگی اسی قدر زیادہ بالیدگی آپ کو نصیب ہوگی۔ اور اسی قدر زیادہ اس چمن کی بہاریں آپ اضافہ کریں گے۔ مگر واقعہ کیا ہے؟ یہاں جو تعلیم و تربیت آپ کو ملتی ہے، جو ذہنیت آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے، جو خیالات، جذبات اور داعیات آپ کے اندر پرورش پاتے

ہیں، جو عادات و اطوار اور خصائل آپ میں راسخ ہوتے ہیں اور جس طرزِ فکر، رنگِ طبیعت، اور طریقِ زندگی کے سانچے میں آپ ڈھالے جاتے ہیں، کیا وہ سب مِل جُل کر اس زمین، اس آب و ہوا اور اس موسم سے کوئی مناسبت بھی آپ کے اندر باقی رہنے دیتے ہیں؟ یہ زبان جو آپ بولتے ہیں، یہ لباس جو آپ پہنتے ہیں، یہ طرزِ زندگی جو آپ اختیار کرتے ہیں، یہ نظریات اور افکار جو آپ اس تعلیم سے حاصل کرتے ہیں ان سب چیزوں کو آخر کون سا لگاؤ آپ کے ان کروڑوں بھائیوں کے ساتھ ہے جن کے درمیان آپ کا جینا اور مرنا ہے۔ اور اس تمدّن کے ساتھ ہے جو آپ کے چاروں طرف چھایا ہوا ہے؟ آپ کی شخصیت اس ماحول میں کس قدر بیگانہ اور یہ ماحول آپ کی شخصیت کے لیے کتنا اجنبی ہے! کاش آپ کے اندر اتنی حس ہی باقی رہنے دی گئی ہوتی کہ آپ اس بیگانگی کو اور اس کی اذیت کو محسوس کر سکتے۔!

آپ اتنا تو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خام اشیاء کو صنعت اور کاریگری سے تیار کرنے کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے لیے کارآمد اور مفید بن سکیں۔ جو چیز اس طرح تیار کی گئی ہو کہ اس سے مدعا حاصل نہ ہو سکے وہ خود بھی ضائع ہوئی اور اس پر کاریگری فضول صرف کی گئی۔ کپڑے پر خیاطی کی قابلیت اسی لیے صرف کی جاتی ہے کہ وہ جسم پر راست آئے۔ یہ بات حاصل نہ ہوئی تو اس کاریگری نے کپڑے کو بنایا نہیں بگاڑ دیا۔ خام جنس پر طباخی کا فن صرف کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے کے قابل ہو جائے۔ اگر وہ کھانے ہی کے قابل نہ ہوئی تو باورچی نے اسے ضائع کیا۔ نہ کہ بنایا۔ بالکل اسی طرح تعلیم کا مدعا بھی یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جن نئے انسانوں

نے جنم لیا ہے اور جن کی جبلّی صلاحیتیں **Potentialities** ابھی خام
حالت میں ہیں ان کو بنا سنوار کر اور بہتر طریقہ پر نشو و نما دے کر اس قابل
بنا دیا جائے کہ جس سوسائٹی نے انھیں جنم دیا ہے وہ اس کے مفید اور کارآمد
فرد بن سکیں اور اس کی زندگی کے لیے بالیدگی اور فلاح اور ترقی کا ذریعہ ہوں۔
مگر جو تعلیم افراد کو اپنی سوسائٹی اور اس کی حقیقی زندگی سے اجنبی بنا دے اس
کے حق میں اس کے سوا آپ اور کیا فتویٰ دے سکتے ہیں کہ وہ افراد کو بناتی
نہیں بلکہ ضائع کرتی ہے؟ ہر قوم کے بچّے دراصل اس کے مستقبل کا محضر
ہوتے ہیں، قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک لوحِ سادہ کی شکل میں آتا ہے
اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔
ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے
اسے دوسروں کے حوالہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں،
خواہ وہ ہماری اپنی موت کا فتویٰ ہی کیوں نہ ہو۔

جب آپ کوئی کپڑا سلواتے ہیں اور وہ آپ کے جسم پر راست نہیں
آتا تو مجبوراً آپ اسے مارکیٹ میں لے جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اونے
پونے بیچ کر کچھ دام ہی سیدھے کر لیں۔ اگر کپڑا کوئی ذی شعور ہستی ہو تو وہ خود
بھی اپنا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سوچ سکتا کہ کہیں نہ کہیں اس کے
سے ناپ اور اس کی سی تراش خراش کے کپڑے کی مانگ ہو تو وہ وہاں
کھپ جائے۔ جب تک کسی جسم پر وہ راست نہ آئے گا، نیلام گھروں
اور کباڑ خانوں میں مارا مارا پھرتا رہے گا۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا بھی
ہے جو ان درس گاہوں سے تیار ہو کر نکلتے ہیں۔ جس سوسائٹی نے انھیں

تیار کرایا ہے اس کے پاس جب یہ تیار ہو کر واپس پہنچتے ہیں، تو وہ بھی محسوس کرتی ہے اور یہ خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ اس کے تمدن اور اس کی زندگی کے لیے ٹھیک نہیں ہیں جس طرح معدہ اس غذا کو قبول نہیں کرتا جو اس کے لیے مناسب نہ ہو اسی طرح سوسائٹی بھی طبعی طور پر ان افراد کو اپنے اندر کھپا نہیں سکتی جو اس کے لیے مناسب نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو اپنے کسی کام کا نہ پا کر نیلام کے لیے پیش کر دیتی ہے، جس قدر و قیمت پر بھی یہ بک سکتے ہیں بیچ ڈالتی ہے اور یہ خود بھی اپنی زندگی کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سمجھتے کہ کہیں بک جائیں۔ آپ غور تو کیجیے کس قدر سخت خسارے میں ہے وہ قوم جو اپنی بہترین انسانی متاع دوسروں کے ہاتھ بیچتی ہے، ہم وہ ہیں جو انسان دے کر جوتی، کپڑا اور روئی حاصل کرتے ہیں! قدرت نے جو انسانی طاقت **Ma n Power**

اور دماغی طاقت **Brain Power** ہم کو خود ہمارے اپنے کام کے لیے دی تھی وہ دوسروں کے کام آتی ہے۔ ان ہٹے کٹے جسموں میں جو قوت بھری ہوئی ہے، ان بڑے بڑے سروں میں جو قابلیتیں بھری ہوئی ہیں، ان چوڑے چکلے سینوں میں جو دل طرح طرح کی طاقتیں رکھتے ہیں، جنھیں خدا نے ہمارے لیے عطا کیا تھا، ان میں سے بمشکل ایک دو فیصدی ہمارے کام آتے ہیں، باقی سب کو دوسرے خرید لے جاتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ اس خسارے کی تجارت کو ہم بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا اصل سرمایۂ زندگی تو یہی انسانی طاقت ہے اس لیے اسے بیچنا نفع کا سودا نہیں بلکہ سراسر ٹوٹا ہے۔

مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں یا تازہ تازہ فارغ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے میں یہ تحقیق کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا کوئی مقصد بھی معین کیا ہے یا نہیں۔ مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزاروں میں کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو، بلکہ بیشتر اصحاب ایسے ہیں جن کے ذہن میں اس امر کا سرے سے کوئی تصوّر ہی نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے یا ہو سکتا ہے۔ مقصد کے سوال کو وہ محض ایک فلسفیانہ یا شاعرانہ مسئلہ سمجھتے ہیں اور عملی حیثیت سے یہ طے کرنے کی کوئی ضرورت ان کو محسوس نہیں ہوتی کہ آخر دنیا کی زندگی میں ہماری کوششوں اور محنتوں کا اور ہماری تمام دوڑ دھوپ کا کوئی منتہا Goal اور کوئی مقصود بھی ہونا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظامِ تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا مقصود معین کر سکے بلکہ زندگی کے لیے کسی نصب العین کی ضرورت محسوس کر سکے۔ یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی! بے مقصد زندگی Aimless بسر کرنا تو حیوانات کا کام ہے۔ اگر آدمی بھی صرف اس لیے جیے کہ جینا ہے اور اپنی قوتوں کا مصرف بقائے نفس اور تناسل کے سوا کچھ نہ سمجھے تو آخر اس میں اور دوسرے

حیوانات میں کیا فرق رہا۔

میری اس تنقید کا یہ مدعا ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو ملامت کروں، ملامت تو قصوروار کو کی جاتی ہے، اور آپ قصوروار نہیں بلکہ مظلوم ہیں۔ اس لیے میں دراصل آپ کی ہمدردی میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ اب جو آپ زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھنے کے لیے جا رہے ہیں تو پوری طرح اپنا جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ فی الواقع اس مرحلہ پر آپ کس پوزیشن میں ہیں، آپ ملّتِ اسلام کے افراد ہیں۔ یہ ملّت کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جو اس میں پیدا ہوا ہو وہ آپ سے آپ مسلم ہو۔ یہ محض ایک ایسے تمدّنی گروہ Cultural Group کا نام بھی نہیں ہے جس کے ساتھ محض معاشرتی حیثیت سے وابستہ ہونا مسلم ہونے کے لیے کافی ہو۔ دراصل اسلام ایک مخصوص نظامِ فکر Ideo-logy کا نام ہے جس کی بنیاد پر تمدنی زندگی اپنے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ تعمیر ہوتی ہے، اس ملّت کی بقاء بالکل اس بات پر منحصر ہے کہ جو افراد اس میں شامل ہوں وہ اس نظامِ فکر کو سمجھتے ہوں اس کی رُوح سے آشنا ہوں اور اپنی تمدّنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس روح کی عملی تفسیر و تعبیر پیش کرنے پر قادر ہوں۔ خصوصیت کے ساتھ ملّت کے اہلِ دماغ طبقہ Intelligentia کے لیے تو سب سے بڑھ کر اس علم و فہم اور اس عمل کی ضرورت ہے کیونکہ یہی طبقہ ملّت کا رہنما اور پیش رو ہے۔ اگرچہ ہر قوم اور ہر گروہ کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا اہلِ دماغ طبقہ اس کی مخصوص قومی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگا

ہوا ہو، لیکن ملّتِ اسلام کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ یہاں ہماری انفرادیت کی اساس نہ خاک ہے، نہ خون، نہ رنگ، نہ زبان، نہ کوئی اور مادی چیز بلکہ صرف اسلام ہے۔ ہمارے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ ہماری ملّت کے افراد اور خصوصاً اہلِ دماغ طبقے اسلامی طرزِ فکر اور اسلامی طرزِ عمل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے ان کی تعلیم و تربیت میں جتنی اور جیسی کمزوری ہوگی اس کا عکس ہماری ملّت کی زندگی میں جوں کا توں نمودار ہوگا۔ اور اگر وہ اس سے بالکل خالی ہوں تو یہ دراصل ہماری موت کا نشان ہوگا۔

یہ وہ حقیقت ہے جس سے یہاں کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں ملّتِ اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملّت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ اس کی غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے؟ ان درس گاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاسیات، تاریخ اور دوسرے تمام وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے۔ مگر آپ کو اسلام کے فلسفے، اسلام کی اساسِ حکمت، اسلام کے اصولِ معیشت، اسلام کے اصولِ قانون، اسلام کے نظریۂ سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ

غیر اسلامی طرز پر سوچنے لگتے ہیں، غیر اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی کے ہر معاملہ کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں۔ منتشر طور پر کچھ معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں۔ مگر وہ غیر مستند اور بسا اوقات غلط اوہام و خرافات کے ساتھ ملی جُلی ہوتی ہیں۔ ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اسلام سے اور زیادہ دُور ہو جاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام سے گہری عقیدت رکھتے ہیں وہ دماغی طور پر غیر مسلم ہو جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ اسلام حق تو ضرور ہو گا اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور جو لوگ اس عقیدت سے بھی خالی ہو چکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اُڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس قسم کی تعلیم پانے کے ساتھ عملاً جو تربیت آپ کو میسّر آتی ہے، جس ماحول میں آپ گھرے رہتے ہیں اور عملی زندگی کے جن نمونوں سے آپ کو واسطہ پیش آتا ہے ان میں مشکل ہی سے کہیں اسلامی کیرکٹر اور اسلامی طرزِ عمل کا نشان پایا جاتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ علمی حیثیت سے اسلام کی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہو، نہ عملی حیثیت سے اسلامی تربیت دی گئی ہو وہ فرشتے تو نہیں ہیں کہ خود بخود مسلمان بن کر اُٹھیں، ان پر وحی تو نازل نہیں ہوتی کہ خود بخود ان کے دل میں علمِ دین ڈال دیا جائے۔ وہ پانی اور ہوا سے تو اسلامی تربیت اخذ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ فکر اور عمل دونوں حیثیتوں سے غیر اسلامی شان رکھتے ہیں تو یہ ان کا قصور نہیں بلکہ ان درس گاہوں کا قصور ہے جو

موجودہ نظامِ تعلیم کے ماتحت قائم کی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ میرا وجدان ہے جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان درس گاہوں میں دراصل آپ کو ذبح کیا جاتا ہے اور اس ملت کی قبر کھودی جاتی ہے جس کے نونہال آپ ہیں۔ آپ نے جس سوسائٹی میں جنم لیا، جس کے خرچ پر تعلیم پائی، جس کی فلاح کے ساتھ آپ کی فلاح اور جس کی زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی وابستہ ہے۔ اس کے لیے آپ بے کار بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ آپ کو صرف یہی نہیں کہ اس کی فلاح کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں بنایا گیا بلکہ دراصل آپ کو باضابطہ اور منظم طریقے پر ایسا بنا دیا گیا ہے کہ بلا ارادہ آپ کی حرکت اس ملت کے لیے فتنۂ سامان ہو حتیٰ کہ آپ اس کی خیر خواہی کے لیے بھی جو کچھ کرنا چاہیں تو وہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو اس لیے کہ آپ اس کی فطرت سے بیگانہ اور اس کے ابتدائی اصولوں تک سے بیگانہ رکھے گئے ہیں اور آپ کی پوری دماغی تربیت اس نقشہ پر کی گئی ہے جو ملتِ اسلام کے نقشہ کے بالکل برعکس ہے۔

اپنی اس پوزیشن کو اگر آپ سمجھ لیں اور اگر آپ کو پوری طرح احساس ہو جائے کہ فی الواقع کس قدر خطرناک حالت کو پہنچا کر اب آپ کو کارزارِ زندگی کی طرف جانے کے لیے چھوڑا جا رہا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات کی کوشش ضرور کریں گے، پوری تلافی تو شاید اب بہت ہی مشکل ہے، تاہم میں آپ کو تین باتوں کا مشورہ دوں گا جن سے آپ کافی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

۱۔ جہاں تک ممکن ہو عربی زبان سیکھنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ اسلام کا ماخذِ اصلی یعنی قرآن اسی زبان میں ہے اور اس کو جب تک آپ اپنی زبان

میں نہ پڑھیں گے، اسلام کا نظامِ فکر کبھی آپ کی سمجھ میں پوری طرح نہ آسکے گا۔ عربی زبان کی تعلیم کا پُرانا ہولناک طریقہ اب غیر ضروری ہو گیا ہے۔ جدید طرزِ تعلیم سے آپ چھ مہینے میں اتنی عربی سیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کی عبارت سمجھنے لگیں۔

۲۔ قرآن مجید، سیرت رسولؐ اور صحابۂ کرام کی زندگی کا مطالعہ اسلام کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے۔ جہاں آپ نے اپنی زندگی کے ۱۲-۱۵ سال دوسری چیزوں کے پڑھنے میں ضائع کیے ہیں وہاں اس سے آدھا بلکہ چوتھائی وقت ہی اس چیز کے سمجھنے میں صرف کر دیجیے، جس پر آپ کی ملت کی اساس قائم ہے اور جس کو جانے بغیر آپ اس ملت کے کسی کام نہیں آ سکتے۔

۳۔ جو کچھ بھلی یا بُری رائے آپ نے ناکافی اور منتشر معلومات کی بناء پر اسلام کے متعلق قائم کر رکھی ہو، اس سے اپنے ذہن کو خالی کر کے اس کا باقاعدہ مطالعہ Systematic Study کیجیے۔ پھر جس رائے پر آپ پہنچیں گے وہ قابلِ وقعت ہوگی۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کے لیے یہ کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق کافی معلومات حاصل کیے بغیر رائے قائم کریں۔

اب میں اس دعا کے ساتھ اپنا یہ خطبہ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے۔ اور آپ کو اس خطرے سے بچائے جس میں آپ پھنسا دیے گئے ہیں۔

—— ٭ ——